اشرف صبوحی

(1905 – 1990)

سید ولی اشرف نام اور صبوحی تخلص، ادبی دنیا میں اشرف صبوحی کے نام سے مشہور ہوئے۔ 11 مئی 1905 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ 1922 میں اینگلو عربک ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ادیب کامل، منشی فاضل، ایف اے اور بی اے کے امتحانات پرائیوٹ طور پر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پاس کر کے 1929 میں محکمہ ڈاک اور تار میں ملازم ہوئے۔

ابتدا میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں۔ دہلی سے شائع ہونے والے ادبی رسالوں میں کئی مضامین شائع ہوئے۔ ایک ادبی ماہنامہ ''ارمغان'' بھی جاری کیا جو دو سال تک شائع ہوتا رہا۔ 1947 میں تقسیم ملک کے بعد لاہور (پاکستان) چلے گئے۔ ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔

اشرف صبوحی نے دہلی کے روزمرہ بامحاورہ ٹکسالی زبان میں ادبی مضامین اور افسانے لکھے اور تراجم بھی کیے۔ ''دلی کی چند عجیب ہستیاں'' اور ''غبارِ کارواں'' ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ ''جھروکے'' افسانوں اور خاکوں کا مجموعہ ہے۔ ''سلمٰی'' (بغداد کا جوہری)، ''بن باسی دیوی''، ''دھوپ چھاؤں''، ''ننگی دھرتی'' اور ''موصل کے سوداگر'' انگریزی کے تراجم ہیں۔ ان کے علاوہ بیس سے زائد بچوں کی کہانیوں پر مشتمل کتابیں ہیں۔

5019CH11

مرزا چپاتی

خُدا بخشے مرزا چپاتی کو، نام لیتے ہی صورت آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ گورا رنگ، بڑی بڑی اُبلی ہوئی آنکھیں، لمبا قد شانوں پر سے ذرا جھُکا ہوا، چوڑا اشفاف ماتھا، تیموری ڈاڑھی، چنگیزی ناک، مغلئی ہاڑ۔ لڑکپن تو قلعے کی درودیوار نے دیکھا ہوگا۔ جوانی دیکھنے والے بھی ٹھنڈا سانس لینے کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ڈھلتا وقت اور بڑھاپا ہمارے سامنے گزرا ہے۔ لُٹے ہوئے عیش کی ایک تصویر تھے۔ رنگ روغن اُترا ہوا محمد شاہی کھلونا تھا جس کی کوئی قیمت نہ رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ دِلّی کے آخری تاج دار ظفر کے بھانجے تھے۔ ضرور ہوں گے۔ پوتڑوں کی شاہ زادگی ٹھیکروں میں دم توڑ رہی تھی، لیکن مزاج میں رنگیلا پن وہی تھا۔ جلی ہوئی رسّی کے سارے بل گن لو۔ جب تک جیے پرانی وضع کو لیے ہوئے جیے۔ مرتے مرتے نہ کبوتر بازی چھوٹی، نہ پتنگ بازی۔ مُرغے لڑائے یا بُلبل، تیراکی کا شغل رہا یا شعبدے بازی کا۔ شطرنج کے بڑے ماہر تھے۔ غائب کھیلتے تھے۔ خدا جانے غدر میں یہ کیوں کر بچ گئے اور جیل کے سامنے والے خونی دروازے نے اِن کے سر کی بھینٹ کیوں نہ قبول کی؟ انگریزی عمل داری ہوئی۔ بدامنی کا کوئی اندیشہ نہ رہا تو مراحم خسروانہ کی لہر اُٹھی۔ خاندانِ شاہی کی پرورش کا خیال آیا پینشنیں مقرر ہوئیں۔ مگر برائے نام۔

لیکن صاحبِ عالم مرزا فخرالدین عرف مرزا فخرو الملقّب بہ مرزا چپاتی نے مردانہ وار زندگی گزاری۔ گھر بار جب کبھی ہوگا، ہوگا۔ ہماری جب سے یاد اللہ ہوئی دم نقد ہی دیکھا۔ قلعے کی گود میں بازیوں کے سوا اور سیکھا ہی کیا تھا جو بگڑے وقت میں آبرو بناتا۔ اپنے والد رحیم الدین حیاؔ سے ایک فقط شاعری ورثے میں ملی تھی، پڑھنا لکھنا آتا نہ تھا۔ پھر زبان توتلی مگر حافظہ اس بَلا کا تھا کہ سو سو بند کے مسدّس ازبر تھے۔ کیا مجال کہ کہیں سے کوئی مصرع بھول جائیں۔ گویا گراموفون تھے، کوک دیا اور چلے۔

ایک دن کسی شخص نے مرزا صاحب کے سامنے یہ مصرع پڑھا

سر عدو کا ہو نہیں سکتا میرے سر کا جواب

اور اس پر مصرع لگانے کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب نے اسی وقت بہترین مصرع لگا کر اس طرح ایک اعلا پایہ کا شعر بنا دیا۔

شہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے
سر عدو کا ہو نہیں سکتا میرے سر کا جواب

قلعہ مرحوم کے حالات اور موجودہ تہذیب پر اُن کی نوکا جھونکی جتنی مزہ دیتی تھی، وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھے پتنگ بازی کے دنگلوں میں لے جاتے تھے۔ مُرغ اور بُلبلوں کی پالیاں بھی دکھائیں۔ تیراکی کے میلوں میں بھی لے گئے۔ کبوتر بھی مجھے دکھا دکھا کر اُڑائے۔ سب کچھ کیا، میں جہاں تھا وہیں رہا۔ ہر جگہ اُن کا دماغ کھایا۔ انھیں بھی میری خاطر ایسی منظور تھی کہ بادلِ خواستہ یا ناخواستہ وہ سب کچھ مجھے بتاتے۔

ایک دن دوپہر کے کوئی دو بجے ہوں گے۔ برسات کا موسم تھا۔ کئی گھنٹے کی موسلا دھار بارش کے بعد ذرا بادل چھٹے تھے کہ حضرت معمول کے خلاف میرے پاس تشریف لائے۔ مُنہ بنا ہوا، آنکھیں اُبلی ہوئی۔ چہرے سے غصّہ ٹپک رہا تھا۔ میں نے کہا خدا خیر کرے۔ آج تو صاحبِ عالم کے تیور کچھ اور ہیں۔ کئی منٹ تک خاموش بیٹھے رہے اور میں ان کا مُنہ تکتا رہا۔ ذرا سانس درست ہوا تو بولے ''سید! اس پٹھانچے کا تُر مغزاپن بھی دیکھا۔ بڑا افلاطون بنا پھرتا ہے۔ باوا تو جھک جھک کر مجرا کرتے کرتے مر گیا، یہ بابو بن کر بابو کی طرح دُلتیاں جھاڑتا ہے۔ ہے شرط کہ چار جامہ کس دوں، ساری ٹرفش نکل جائے گی۔''

میں : میں بالکل نہیں سمجھا۔ ہوا کیا؟ کون پٹھانچہ؟

مرزا : ایسے ننّھے سمجھے ہی نہیں۔ میاں! وہی کالے خاں کا لڑکا جو کچہری میں نوکر ہے۔

میں : منیر۔ کیا اس نے کچھ گستاخی کی؟

مرزا : گستاخی! نہ ہوا ہمارا زمانہ، خاندان بھر کو کولھو میں پسوا دیتا۔

میں : بڑا نالائق ہے۔ کیا بات ہوئی؟

مرزا : ہوا یہ کہ میں کبوتروں کا دانہ لینے نکلا۔ گلی کے نکڑ پر بنیے کی دُکان ہے۔ نالیوں میں دھائیں دھائیں پانی بہہ رہا تھا۔ ساری گلی میں کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ محلّے والوں نے جابجا پتّھر رکھ دیے تھے کہ آنے جانے والے اِن پر پاؤں (پاؤں) رکھ کر گزر جائیں۔ دیکھتا کیا ہوں وہ اکڑے خاں بیچ گلی میں کھڑے ہوئے ایک خوانچے والے سے جھک جھک کر رہے ہیں۔ گلی تنگ، کیچڑ اور پانی۔ پتّھروں پر ان کا قبضہ۔ کوئی بھلا اس پر گزرے تو کہاں سے؟ میں نے کہا کہ میاں راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو۔ یہ کون سی انسانیت ہے کہ سارا راستہ روک رکھا ہے۔ تڑّا کر جواب دیا کہ چلے جاؤ۔ مجھے تاؤ آ گیا۔ بولا کہ تمھارے سر پر سے جاؤں۔ بس پھر کیا تھا جامے سے باہر نکل پڑا۔ وہ تو پاس پڑوس کے دو چار آدمی نکل آئے اور بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ آج یا وہ نہیں تھا یا میں۔ خیر جاتا کہاں ہے۔ آج کے تُھپے آج ہی نہیں جلا کرتے۔

میں : صاحبِ عالم! آپ اپنی طرف دیکھیے۔ جو ظرف میں ہوتا ہے وہی چھلکتا ہے۔ آنے دیجیے وہ ڈانٹ بتاؤں کہ ہاتھ جوڑتے

بنے.........................سُنا ہے کہ قلعے کے آخری دور ہی میں شہر کی حالت بدل گئی تھی۔ نہ چھوٹوں کا رکھ رکھاؤ رہا تھا نہ بڑوں کا ادب۔

مرزا : توبہ توبہ تم نے تو دلّی کو دم توڑتے بھی نہیں دیکھا۔ اس کا مردہ دیکھا ہے۔ مُردہ، وہ بھی لاوارث! میاں شہر آبادی کی باتیں قلعے والوں کے صدقے میں تھیں۔ جیسے جیسے وہ اُٹھتے گئے دلّی میں اصلیت کا اندھیرا ہوتا گیا۔ اب تو نئی روشنی ہے نئی باتیں۔ اور تو خدا بخشے دلّی کی صفتیں تم کیا جانو۔ پڑھے لکھے ہو۔ شاعری کا بھی شوق ہے۔ بھلا بتاؤ تو سہی اُردو کی کتنی قسمیں ہیں؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا ''صاحبِ عالم اُردو کی قسمیں کیسی؟ یہ بھی ایک کہی۔ مجھ پر بھی داؤ کرنے لگے۔'' ''واہ بھئی معلوم ہوا کہ تم دلّی والے نہیں۔ کہیں باہر سے آکر بس گئے ہو۔'' میں شرمندہ تھا کہ کیا جواب دوں۔ میرے نزدیک تو صرف ایک ہی قسم کی اُردو تھی۔ زیادہ سے زیادہ عوام دخواص کا فرق سمجھ لو۔ مگر یہ قسمیں کیا معنی؟ مجھے چُپ دیکھ کر مرزا مُسکرائے اور کہنے لگے ''سیّد پریشان نہ ہو۔ مجھ سے سُن اور یاد رکھ۔ بھولیو نہیں پھر پوچھے گا تو نہیں بتاؤں گا۔'' میں بڑے شوق سے متوجّہ ہوا اور انھوں نے انگرکھے کے دامن سے مُنہ پونچھ کر کہنا شروع کیا۔ دیکھ اوّل نمبر پر تو اُردوئے معلّٰی ہے جس کو ماموں حضرت اور اُن کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے بولتے تھے۔ وہاں سے شہر میں آئی اور قدیم شرفا کے گھروں میں آ چھپی۔ دوسرا نمبر قل آعوذ اُردو کا ہے جو مولویوں، واعظوں اور عالموں کا گلا گھوٹتی رہتی ہے۔ تیسرے خود رنگی اُردو۔ یہ ماں ٹینی باپ کلنگ والوں نے رنگ برنگ کے بچّے نکالے ہیں۔ اخبار اور رسالوں میں اِسی قسم کی اُردو، ادب کا اچھوتا نمونہ کہلاتا ہے۔ چوتھے ہُڑدنگی اُردو، مسخروں اور آج کل کے قومی بلّم ٹیروں کی مُنہ پھٹ زبان ہے۔ پانچویں لفنگی اُردو ہے جسے آ کا بھائیوں کی لٹھ مار، کڑاکے دار بولی کہو یا پہلوانوں، کرخنداروں، ضلع جگت کے ماہروں، پھبتی بازوں اور گلیروں کا روزمرّہ۔ چھٹے نمبر پر فرنگی اُردو ہے جو تازہ ولایت انگیز۔ ہندستانیوں عیسائی ٹوپ لگائے ہوئے کرانی، دفتر کے بابو، چھاونیوں کے سوداگر وغیرہ بولتے ہیں۔ پھر ایک سربھنگی اُردو ہے یعنی چرسیوں، بھنگڑوں، بےنواؤں اور تکیے داروں کی زبان۔'' میں نے کہا آج تو بہرہ کھُلا ہوا ہے۔ بھئی خوب تقسیم ہے کیوں نہ ہو، آخر شاہ جہانی دیگ کی کھُرچن ہے۔ میری طرف دیکھ کر ایک گہرا ٹھنڈا سانس بھرا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگے ''سیّد! ابھی تم نے کیا دیکھا ہے اور کیا سُنا ہے۔ قلعہ آباد ہوتا، دربار دیکھے ہوتے تو اصلی زبان کا بناؤ سنگار نظر آتا۔ اب تو ہماری زبان بیسنی ہو گئی ہے۔ وہ لچیلی چونچلے کی باتیں، شریفوں کے انداز، امیروں کی آن، سپاہیوں کی اکڑفوں، وہ خادمانہ اور خوردانہ آداب وانکسار، شاعروں کے لچھّے دار فقرے، شہروالوں کا میل جول، پرانے گھرانوں کے رسم ورواج، وہ مرّوت وہ آنکھ کا لحاظ کہاں؟ مجلسوں محفلوں کا رنگ

بدل گیا، میلے ٹھیلے، پرانے کرتب، اگلے ہنر سب مٹتے جاتے ہیں۔ اشراف گردی نے بھلے مانسوں کو گھر بیٹھا دیا۔ فیل نشین، پالکیوں میں بیٹھنے والے کھپریلوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ مفلسی، ناداری نے رذالوں کے آگے سر جھکوا دیے۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھ گئی۔ کم ظرفوں، ٹینیوں کے گھر میں دولت پھٹ پڑی۔ زمانہ جب کمینوں کی پشتی پر ہو تو خاندانیوں کی کون قدر کرتا؟ پیٹ کی مار نے صورتیں بگاڑ دیں، چال چلن میں فرق آ گیا۔ ہمّت کے ساتھ حمیّت بھی جاتی رہی۔

مرزا نے یہ تقریر کچھ ایسے عبرت خیز لفظوں میں کی کہ میرا دل بھر آیا اور میں نے گفتگو کا پہلو بدلنے کی کوشش کی۔

میں : کیوں حضّت، غدر سے پہلے دِلّی والوں کا لباس کیا تھا؟ دو چار پرانی وضع کے لوگ دیکھنے میں آئے ہیں۔ اُن کی برزخ تو کچھ عجیب ہی سی معلوم ہوتی تھی۔

مرزا : جھوٹے ہو تم نے کہاں دیکھا ہوگا۔ کوئی بہروپیا یا نقّال نظر آ گیا ہوگا۔ میاں اُن وقتوں میں ادنا اعلا میں یک رنگی نہ تھی............ درباری اور بازاری لوگ لباس سے پہچانے جاتے تھے۔ عام طور پر اپنی شکل و شباہت، تن وتوش، جسامت اور پیشے کے مطابق کپڑا پہنا جاتا تھا کہ دُور سے دیکھ کر پہچان لیں کہ کس خاندان کا اور کیسا آدمی ہے؟ اگر نوجوان ہے تو ایک ایک ٹانکے پر جوانی برستی ہے۔ بوڑھا ہے تو پیری اور سادگی ٹپکتی ہے۔ بانکوں کا بانک پن، چھیلاؤں، ملاّؤں کی ملاّئی، پہلوانوں کی پہلوانی، رذالوں کی رذالت اور شریفوں کی شرافت لباس سے صاف بھانپ لی جاتی تھی۔ چھوٹے آدمی جس پوشاک کو اختیار کر لیتے تھے، بھلے مانس چھوڑ دیتے تھے۔ دو پلڑی ٹوپیوں کا عام رواج تھا مگر چوگوشی، پنچ گوشی، گول، مغلئی، تاج دار ٹوپیاں، مغل بچّے اور شریف زادے پہنتے تھے۔ قلعے کے آنے جانے والوں میں مندیلیں، بنارسی دوپٹّے، گولے دار پگڑیاں— مسلمانوں کا حصّہ تھا۔ درباری جامہ بھی پہنا کرتے تھے۔ اُمرا چغہ سرپیچ اور شہزادوں میں کلغیاں بھی مروّج تھیں۔ ہندوؤں میں پہلے جامے کا زیادہ دستور تھا، پھر نیم جامہ اور اُلٹی چولی کے انگرکھے پہننے لگے۔ علاوہ ازیں الخالق، اچکن، قبا، عبا، جبّہ، چغہ، مرزئی وغیرہ بھی استعمال ہوتے تھے۔ پایجامے یا تو تنگ موری کے یا اِک برے یا غرارے دار ہوتے تھے۔ ڈاڑھی مونچھوں کی وضع بھی ہر خاندان اور ہر پیشہ ور کی علاحدہ تھی۔

میں : مگر یہاں والوں کو فضول کھیلوں، دولت کو لٹانے والی بازیوں اور بے کار مشغلوں کے سوا کام ہی نہ تھا۔

مرزا : تم کیا جانو کہ وہ بازیاں اور اُن کے مشغلے کیسے کمال کے تھے۔ ویسے ہُنر آج کوئی نہیں پیدا کر لیتا۔ زہرہ پھٹ جائے زہرہ۔ بات یہ ہے کہ ساری چیزیں وقت سے ہوتی ہیں۔ نامردوں کا زمانہ ہے تو نامردوں کی سی باتیں بھی ہیں۔ شریفوں کا شغل ڈنڑ، مگدر، بانک، بنّوٹ، پھکیتی، اِکنگ، تیراندازی، نیزہ بازی، پنجہ کشی تھا۔ کہہ دو بے کار تھا۔ تیراکی، کشتی، شکرے اور باز

کا شکار، پتنگ لڑانا، کبوتر بازی وغیرہ سے دل چسپی تھی۔ کہہ دو یہ بھی فضولیات ہیں۔

میں : فضولیات نہیں تو اور کیا ہیں؟

مرزا : جی ہاں فضولیات ہیں۔ خُدا کے بندے ان ہی باتوں سے تو دلّی دلّی تھی۔ ورنہ شاہجہاں کی بسائی ہوئی محمد شاہی دِلّی اور خورجہ بلند شہر میں کیا فرق۔ پھکیت اور بنوٹیے ایسے ہوتے تھے کہ موقع پڑتا تو رومال میں صرف پیسا یا ٹھیکری باندھ کر حریف کے سامنے آجاتے اور دو جھکائیوں میں ہتھیار چھین لیتے۔ تیراکی کا یہ حال تھا کہ پالتی مارے ہوئے پانی پر بیٹھے ہیں جیسے مسند پر...... دُھواں اُڑاتے اور ملہار سنتے چلے جاتے ہیں۔ قلعے کی حمام والی نہر تو دیکھی ہوگی۔ گز سوا گز کا پاٹ ہے اور بالشت بھر سے زیادہ گہرائی نہیں۔ اس میں آج کوئی مائی کا لال تیر کر دکھائے تو میں جانوں۔ میر مچھلی تو خیر اُستاد تھے، ان کا سا کمال تو کسے میسّر ہے۔ دو چار گز تو اتنے پانی میں تیر کر میں بھی دکھا سکتا ہوں۔

میں : اجی جناب آپ ریت پر تیریے، حبابوں پر کھڑی لگائیے، نتیجہ؟ کھیل ہی تو تھے۔ پھر یہ کبوتر بازی، پتنگ بازی، مُرغ بازی، مینڈھے بازی کیا بلا تھی؟ بچارے بے زبانوں کو لہولہان کرنا اور اپنا دل بہلانا کیا اچھّے ہنر تھے۔

مرزا : ارے میاں ایرانی تورانی منچلے، دہم ہو کر کیا چوڑیاں پہن لیتے۔ جنگ و جدال کا خیال انسانی قربانیوں، ملک ستانیوں کے چاؤ، خون کی پچکاریوں سے ہولی کا وقت تو لد گیا تھا۔ نہ ان پر کوئی چڑھ کر آتا تھا نہ یہ کہیں چڑھائی کرتے تھے۔ انگریزی عمل داری کی برکت سے نکسیریں بھی نہیں پھوٹتی تھیں۔ وہ جانوروں کو ہی لڑا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔

میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ مرزا نے ایک جُھرجُھری لی اور یہ کہتے ہوئے کہ بھئی غضب ہو گیا شام ہونے آئی۔ کبوتر بھوکے میری جان کو رو رہے ہوں گے اور چوک کا وقت بھی آ لگا ہے۔ لال بند کا جوڑا لگانا ہے، یہ جا وہ جا۔

ان باتوں کو کوئی ایک مہینا گزرا ہوگا کہ صبح ہی صبح مرزا صاحب چلے آتے ہیں۔ آتے ہی فرمانے لگے ''پرانی عیدگاہ چلنا ہوگا۔'' میں نے کہا ''خیریت؟'' بولے ''لکھنؤوں سے پیچ ہیں۔ جانوں ڈھیری یا مالوں ڈھیری۔ پانچ روپے، پیچ ٹھہرا ہے، بڑا معرکہ ہوگا۔'' میں نے عرض کیا ''صاحبِ عالم مجھے نہ تو پتنگ بازی سے کوئی دل چسپی ہے نہ میرے پاس اتنا فضول وقت ہے کہ آپ کے ساتھ واہی تباہی پھروں۔'' تاؤ کھا کر آنکھیں نکال لیں اور حاکمانہ انداز سے کہنے لگے ''تمھاری اور تمھارے وقت کی ایسی تیسی۔ بس کہہ دیا کہ چلنا ہوگا۔ دو پہر کو آؤں گا تیّار رہنا۔'' میں بہت پریشان ہوا مگر کرتا کیا، دوستی تھی یا مذاق۔ قہر درویش بجانِ درویش۔ اپنی ساری ضرورتوں کو طاق پر رکھا اور حضرت مرزا چپاتی کا منتظر تھا کہ ٹھیک بارہ بجے آواز پڑی ''سیّد آؤ''۔ آگے آگے مرزا صاحب اور پیچھے پیچھے میں۔ اجمیری دروازے سے نکل کر قبرستان لانگتے پھلانگتے پرانی عیدگاہ پہنچے۔ وہاں دیکھا تو خاصا

میلا لگا ہوا ہے۔ کبابی، کچالووالے، دہی بڑوں کی چاٹ، پان بیڑی، پانی پلانے والے سقّے، پوری خرافات موجود ہے۔ جا بجا پتنگ بازوں کی ٹکڑیاں بیٹھی ہیں۔ مرزا صاحب کو دیکھتے ہی ''صاحبِ عالم ادھر،'' ''مرزا صاحب ادھر،'' ''اُستاد پہلے میری سن لیجیے''، ''میاں ادھر آنے دو۔ بات سمجھتے ہیں نہ بات کی دُم، اُڑنے سے کام۔'' ''حضّت آپ یہاں آیئے۔ میر کنکیّا آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔'' چاروں طرف سے آوازیں پڑنے لگیں۔ مرزا چوکنّے ایک ایک کو جواب دیتے، شامیانے کے نیچے جہاں میر کنکیّا تشریف فرما تھے، پہنچے۔

میر کنکیّا لکھنؤ کے واجد علی شاہی پتنگ باز تھے۔ کاکریزی رنگ، گول چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑی ناک، دانتوں میں کھڑکیاں، سر پر کڑ بڑے پٹّھے۔ خشخاشی ڈاڑھی، چھاتی کھُلا، سنجاف دار ڈھیلا ڈھالا انگرکھا، سر پر دوانگل کی کلابتو کے حاشیے کی ٹوپی، پاؤں میں مخملی گرگابی، کلّے میں گلوری، اُٹھ کر مرزا چپاتی سے بغل گیر ہوئے۔ پھر جو پتنگ بازی کا ذِکر شروع ہوا تو تین بج گئے۔ میں بے وقوفوں کی طرح بیٹھا ہوا ایک ایک کا مُنہ تک رہا تھا۔ پتنگ بازی کی ہوتی تو اُن کی اصطلاحیں سمجھ میں آتیں۔ آخر خدا خدا کرکے لوگ اپنی اپنی ٹکڑیوں میں گئے۔ آسمان پر چیل کوّے منڈلانے شروع ہوئے۔ میں مرزا صاحب کے ساتھ تھا۔ عید گاہ کی دیوار کے نیچے سے اُنھوں نے بھی اپنا اختر بختر کھول کر ایک انگارا ادّھا اُڑایا۔ پچکا ایک لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ کوئی دس منٹ تک جھکایاں دیتے رہے، پیچ ہوا۔ کبھی آگے بڑھتے تھے کبھی پیچھے ہٹتے تھے۔ ایک دفعہ ہی جھلّا کر لڑکے کو تمانچا رسید کیا اور بولے ''ابے پچکا پکڑنے کی سُرت بھی نہ تھی تو یہاں آن کیوں مرا آخر کٹوا دیا نا۔''

پھر ایک الفن بڑھائی اور اب کے پچکا پکڑنے کی خدمت مجھے انجام دینی پڑی۔ بدقسمتی سے یہ گڈّی بھی کٹ گئی۔ بہت بگڑے کہ بس جب تم جیسے منحوس ساتھ ہوں تو ہم اُڑا چکے۔ غضب ہے سانولیا ہمیں اُستاد کہنے والا، میر گولنداز ہمارے ہاں کے شاگرد، شیخ پچک جیسے برابر پیچ نکالے جاتے ہیں اور مرزا فخرو اوپر نیچے دو کنکوّے کٹوائے۔ ''سیٹھو میاں سیٹھو مجھے اپنی استادی تھوڑی گنوانی ہے۔'' وہ کہتے رہے، میں تو وہاں سے ہٹ کر رومال بچھا کر الگ جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی اپنا اسبابِ جہالت لُنگی میں باندھے میرے پاس آ بیٹھے۔ تیوری پر بل تھے، چہرہ سُرخ، آنکھیں اُبلی ہوئی۔ میں نے کہا مرزا صاحب ہوا کا کھیل ہے۔ اس میں کسی کی کیا پیری۔ آپ کی اُستادی میں کہیں فرق آتا ہے۔ سلطنت ہی جب ہتّھے پر سے کٹ گئی تو ان دو کاغذ کے ٹکڑوں کا کیا غم! آپ، آپ ہی ہیں۔ کہنے لگے ''سچ کہتے ہو میاں۔ ہم قلعے والوں کی تقدیر ہی خراب ہے۔ ہوا بھی موافقت نہیں کرتی۔ میں نے اُن کے بشرے سے اُن کی دِلی تکلیف کا اندازہ کرتے ہوئے اس ذکر کو موقوف کر دیا۔ اور پوچھا'' کیوں مرزا صاحب قلعہ جب آباد تھا اس وقت بھی پتنگ بازی کے ایسے ہی دنگل ہوتے تھے؟''

مرزا : اِک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔ اس وقت کا سماں کیوں کر دکھاؤں۔ میاں ہر بات میں اک شان تھی، ایک قاعدہ تھا اور ہزاروں غریبوں کی روٹیوں کے سہارے۔ معمول تھا کہ عصر کا وقت ہوا اور سلیم گڑھ پر جمگھٹ لگا۔ بڑے بڑے پتنگ، دوتاوی اور سہ تاوی تکلّیں، ڈور کی چرخیاں لے کر شاہی پتنگ باز پہنچ گئے، خلوت کے امیر اور شوقین شہزادے مرزا ننّو، مرزا کدال، مرزا کالیٹن، مرزا چڑیا، مرزا جھر جھری بھی آموجود ہوئے۔ یہ سلاطین زادے بہت مُنہ چڑھے تھے۔

میں : (بات کاٹ کر) حضّت یہ نام کیسے؟ کیا اسی بولی کا نام اُردوے معلّیٰ ہے؟

مرزا : کچھ پڑھا لکھا بھی، یا گھاس ہی کھودتے رہے ہو۔ ارے زبان کی ٹکسال قلعے ہی میں تو تھی وہاں محاورات نہ ڈھلتے تو کہاں ڈھلتے۔ طبیعتیں ہر وقت حاضر رہتی تھیں۔ ہر بات میں جدّت مدِّ نظر تھی۔ ہنسی مذاق میں جو مُنہ سے نکل گیا گویا سکّہ ڈھل گیا۔ کسی کے پھٹے پھٹے دیدے ہوئے مرزا ہٹّو کہہ دیا۔ لمبا چہرہ، چگّی ڈاڑھی دیکھی، مرزا چُگّا یا مرزا کدال کہنے لگے۔ چکلے چہرے والے پر چوپال کی اور ٹھنگنے پر گھٹنّے کی پھبتی اُڑا دی۔ غرض کہ مرزا چیل، مرزا جھپٹ، مرزا یاہو، مرزا رنگیلے، مرزا رسیلے، بیسوں اسم بامسمّیٰ تھے۔ میں جمعرات کو چپاتیاں اور حلوا بانٹا کرتا تھا، میرا نام مرزا چپاتی مشہور کر دیا۔

میں : لیجیے ہمیں آج تک مرزا چپاتی کی وجہ تسمیہ ہی معلوم نہ تھی۔ یہ آپ کا خیر سے ٹکسالی نام ہے۔

مرزا : اب زیادہ نہ اِتراؤ۔ قصّہ سُنتے ہو یا کوئی پھبتی سُننے کو جی چاہتا ہے۔

میں : اچھا اب کان پکڑتا ہوں بیچ میں نہیں بولوں گا۔ فرمائیے۔

مرزا : سب سامان لیس ہو گیا تو بڑے حضرت کی سواری آئی۔ دُعا سلام مجرے کے بعد حکم لے کر دریا کی طرف پتنگ بڑھایا گیا۔ دوسری جانب سے معین الملک نظارت خاں بادشاہی ناظر کا، مرزا یاور بخت بہادر یا جس کے لیے پہلے سے ارشاد ہو چکا ہے، پتنگ اٹھا۔ ریتی میں سوار کھڑے ہو گئے۔ پیچ لڑے، ڈھیلیں چلیں۔ پتنگ یا تُکلّیں جھپکتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ یا ہاتھ روک کر ڈور دی تو ڈوبتے آسمان سے جا لگیں۔ پیٹا چھوڑ دیا، ڈوریں زمین تک لٹک آئیں، سواروں نے دوشاخے بانسوں پر لے لیں۔ پتنگ کٹا تو دریا کے وار پار ڈور پڑ گئی۔ ڈوریں لٹیں۔ پتنگ کے پیچھے پیچھے غول کے غول شاہدرہ تک نکل گئے۔ جس نے وہ تکّل یا پتنگ لوٹی پانچ روپے کی مزدوری کی۔ ڈور بھی بیس بیس تیس تیس روپے سیر بک جاتی تھی۔ بادشاہ کبھی تو خالی سیر ہی دیکھتے رہتے۔ کبھی جی میں آتا تو تختِ رواں سے اُتر پڑتے۔ مچھلی کے چھلکوں کے دستانے پہن لیے۔ پتنگ ہاتھ میں لیا، ایک آدھ پیچ لڑایا اور ہنستے بولتے محل معلّیٰ میں داخل ہو گئے۔ سیّد! یہ بھی خبر ہے کہ وہ پتنگ یا تکّلیں کتنی بڑی اور کیسی محنت سے بنائی ہوئی ہوتی تھیں۔ تکلّیں تو تمھارے پیدا ہونے سے پہلے مر چکیں۔ خیر میں کبھی ان

کی تصویر دکھاؤں گا۔تو وہ قدِ آدم ہوتی تھی اور ایک ایک کی تیاری میں کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ ڈوریں بھی اِک بلی، دو بلی، تبلی، چوبلی کنکّوں اور تکلّوں کے زور کے موافق بنتی تھیں۔ مانجھوں کے نسخے بھی ہر گھرانے کے الگ تھے۔تکّلیں تو تکّلیں آج ویسے پتنگ بھی نہ بنتے ہیں نہ کسی میں اتنا بوتا ہوتا ہے کہ اُن کی جھونک سنبھال سکے۔ چھوٹی تخّیں رہ گئی ہیں یا بڑے نامی پتنگ بازوں کے ہاں اڈّھے۔ وہ بھی کنکوّے نہیں گڈّیاں ہوتی ہیں۔ لنڈوری بن پنچھلّے کی۔

میں : بھئی واقعی لُطف تو بڑا آتا ہوگا۔

مرزا : جہاں اپنی حکومت، گھر کی بادشاہت اور پرائی دولت ہوتی ہے، یہی رنگ ہوا کرتے ہیں۔عشرت گاہوں میں ہر وقت نمازیں نہیں پڑھی جاتیں۔ مجاہدے اور مراقبے نہیں ہوتے، یہ نہ اٹھائیں تو زندگی کی راحتیں کون اٹھائے۔ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔سلطنتوں کی بھی عمریں ہوتی ہیں۔جس طرح آدمی کوئی پیٹ میں، کوئی پیدا ہوتے ہی، کوئی بچپن میں، کوئی جوان ہوکر، اور کوئی عمرِ طبعی طے کرنے کے بعد مرتا ہے، اسی طرح بادشاہتیں ہیں۔کوئی ایک پُشت چلتی ہے، کوئی دو پُشت۔ کسی کا سلسلہ سو پچاس ہی برس میں ٹوٹ جاتا ہے اور کسی کی عمارت صدیوں کی خبر لاتی ہے۔مغلوں نے چھے سو برس تخت کو سنبھالا۔ آخر بڑھاپا تو سب ہی کو آتا ہے۔اُن کے کندھے بھی شل ہو گئے۔ دنیا کا یہی کارخانہ ہے۔آج اس کا، تو کل اس کا زمانہ ہے۔موت اور زوال بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ ہمارے لیے عیش وعشرت ہی بہانہ ہوگئی۔

میں سمجھتا تھا کہ مرزا نرے شہزادے ہیں اور ان کی معلومات میں بازیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔آج معلوم ہوا کہ قلعے والوں کا دماغ بگڑی میں بھی کتنا بنا ہوا تھا۔ میں نے کہا'' مرزا صاحب! یہ آپ نے کس فلسفی کا لکچر یاد کر لیا ہے۔ دو چار جملوں میں کیسے کیسے نکتے حل کر گئے۔''بولے'' پیارے ہمارے احوال پر نہ جاؤ۔ جان کر دیوانے بنے ہوئے ہیں۔نہیں تو کیا نہیں جانتے کیا نہیں آتا

عالم میں اب تلک بھی مذکور ہے ہمارا
افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا''

—— اشرف صبوحی

سوالوں کے جواب لکھیے :

1۔ مرزا چپاتی کون تھے اور ان کا حلیہ کیا تھا؟
2۔ مرزا چپاتی نے اردو زبان کی جو قسمیں بتائیں ان کے نام اور خصوصیات لکھیے۔
3۔ مرزا چپاتی نے کیوں کہا کہ ''دنیا کا یہی کارخانہ ہے۔آج اِس کا، تو کل اُس کا زمانہ ہے۔''
4۔ قلعے کی پتنگ بازی اور آج کی پتنگ بازی میں کیا فرق ہے؟